غالب کی نرگسیت

قافیہ ردیف کی پابندی کے ساتھ دو مصرعوں میں بڑے سے بڑے مضمون کے سمو دینے کو غالب کے الفاظ میں "تنگنائے" قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن بعض اوقات کامیاب اظہار میں رکاوٹ کا باعث بننے والی یہ پابندیاں ایسی نفسیاتی اہمیت کی حامل ثابت ہوتی ہیں کہ اس سے شاعر کے نفسی رجحانات کی کلی تفہیم کا دعویٰ نہ کرتے ہوئے بھی بسا اوقات ایک اشاریہ کی صورت یقیناً اختیار کر لیتی ہیں۔ اسی لیے تو قلی قطب شاہ سے لیکر آج کے دور میں فراق تک ہر انفرادیت پسند غزل گو کے اشعار میں نفسی اہمیت کے ایسے اشارے جاتے ہیں کہ جن سے اس کی شخصیت کے بعض ایسے پہلوؤں کو بھی سمجھا جا سکتا ہے، جن کی جانب تذکرہ نگاروں یا جدید نقادوں کی نگاہ نہ گئی تھی۔

غزل میں قافیہ کی پابندی کے خلاف بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لکھا جا رہا ہے۔ اور لکھا جائے گا۔ یہ تمام اعتراضات غلط نہیں قرار دیے جا سکتے اور نہ اس مضمون میں اس معاملہ کے تمام فنی پہلوؤں کا احاطہ ہی مقصود ہے۔ میں صرف قافیہ کی

نفسیاتی اہمیت اجاگر کرنی چاہتا ہوں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ غزل کے اشعار قافیہ ہی کی بنا پر نفسیاتی اشاریہ کی صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ قافیہ پر غالباً سب سے بڑا اعتراض یہی ہے کہ اس میں شاعر کا خیال قافیہ کے تابع ہے۔ لیکن میری دانست میں اسی سے قافیہ کی نفسیاتی اہمیت جنم لیتی ہے۔ کیونکہ غزل کی تخلیق میں شاعر کا ذہن تلازم خیالات[1] کے اصول کے تحت کام کرتا ہے۔ تلازم خیالات اہم نفسیاتی مباحث میں سے ہے اور اس کی لمبی چوڑی وضاحت کیے بغیر اتنا ہی بتا دینا کافی ہے کہ دیپ سے دیپ جلنے کی مانند ایک خیال سے دوسرے خیال کا چراغ روشن ہوتا ہے۔ ایک خیال سے دوسرے خیال کا جنم لینا لاشعوری عوامل کا مرہون منت ہوتا ہے۔ ناآسودہ خواہشات اظہار کی تشکیل کے لیے فوق الانا (SUPER EGO) کی آنکھ بچا کر شعور کے چور دروازوں سے وقتاً فوقتاً جھانک لینے ہی پر اکتفا کرتی ہیں۔ گو شعور اور اس کے پہرے دار بھی سخت ہیں۔ لیکن یہ ناآسودہ خواہشات خوابوں، قلم اور زبان سے غلط الفاظ کے ٹپک پڑنے اور ایسے ہی بظاہر بے ضرر طریقوں سے سامنے آتی رہتی ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے پہلے تحلیلِ نفسی کے حامیوں اور بعد ازاں ژنگ نے آزاد تلازمہ کو اپنی معالجاتی تکنیک میں کافی سے زیادہ اہمیت دی بلکہ ژنگ نے تو اس پر ایک مفصل کتاب بھی لکھی۔

عملِ تخلیق بظاہر غیر پیچیدہ معلوم ہوتا ہے، خصوصاً آمد کی صورت میں تو یوں لگتا ہے، گویا شعر پہلے سے ہی ذہن میں موجود تھا۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ غزل گو (یا کوئی بھی فنکار) مصروفِ تخلیق ہو تو اس کی تمام نفسی توانائی فکری قوتوں کے ساتھ مل کر ایک نکتہ پر مرکوز ہوتی ہے۔ ادھر نفسی میلانات ایک خاص انداز سے

---

[1] ASSOCIATION OF IDEAS

شعور کو اپنے رنگ میں رنگنے کے لیے سعی کناں رہتے ہیں اور پھر لاشعوری عوامل ان سب پر مستزاد! یہ سب مل کر اس اعصابی تناؤ پر منتج ہوتے ہیں، جو صرف کامیاب تخلیق ہی سے آسودگی پا سکتا ہے۔ اسی لیے تو تخلیق کے وقت ادیب اور فن کار بعض اوقات جس ذہنی کرب اور روحانی اذیت سے دوچار ہوتے ہیں، اسے صرف بچہ کی پیدائش ہی سے مشابہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ پھر تخلیق یا موضوع کی خاطر خواہ انجام دہی کے بعد وہ کسی ماں جیسا ہی سکون اور فخر محسوس کرتے ہیں۔ جس طرح ماں اپنے بچوں کی درجہ بندی نہیں کر سکتی۔ اسی طرح ادیب اور فنکار بھی بالعموم اپنی تخلیقات میں سے کسی ایک کو دوسری پر ترجیح نہیں دے پاتا، لیکن تخلیق کی اس کے علاوہ ایک صورت اور بھی ہے۔ اس صورت میں بعض اوقات تخلیق کار خود کو ایک خاص طرح کی خود فراموشی اور ارتفاعی (SUBLIMATIONAL) حالت میں پاتا ہے۔
ایسی حالت جسے صوفیاء کے جذب اور مستی سے مشابہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ صوفی اپنے سامنے ایک اعلیٰ اور ارفع ہستی (خدا) کو محسوس کر کے خود فراموش ہوتا ہے۔ اسی طرح شاعر بھی لاشعور سے مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے۔ ہر دو کیفیات نفسیاتی اہمیت کی حامل ہیں۔

یہ تفصیلی تجزیہ اس لیے ضروری تھا کہ تنگنائے غزل نے کئی شاعروں کے لیے نفسی پیچ کا کام کرتے ہوئے ان سے ایسے اشعار ادا کرائے۔ جن سے آج ہم انکی شخصیت کے بارے میں بہت کچھ جان سکتے ہیں۔ قلی قطب شاہ، ولی، میر، غالب، مومن، حسرت، فراق وغیرہ کی غزلوں میں ایسے اشعار کی کمی نہیں، جنہیں نفسیاتی اشاریہ قرار دیا جا سکے۔

غالب کے بیشتر شخصیت نگاروں نے اس کی انفرادیت پسندی، عزت نفس، جدت پسندی وغیرہ کا خصوصی تذکرہ کیا ہے۔ اگر ان اور اس نوع کے دیگر شخصی

رجحانات کو کسی ایک نفسیاتی اصطلاح سے ظاہر کرنے کی کوشش کی جائے تو میرے خیال میں "نرگسیت" سے بڑھ کر اور کوئی موزوں اصطلاح نہ ملے گی. کیا سبھی فنکار روایت کے نرگس کی مانند اپنے ہی فن کو آئینہ بنا کر اس میں اپنا عکس جمیل دیکھنے میں محو رہتے ہیں ؟ کیا فن میں نرگسیت کا اظہار یا تسکین قاری کے لیے مفید ہے یا غیر مفید ؟ اور کیا یہ رجحان بذاتِ خود صحت مند بھی ہے ؟ یہ اور ایسے ہی دیگر سوالات دلچسپ تو ہیں لیکن ان کی تفصیلات میں جانا اس مضمون کے موضوع سے خارج ہے. اس ضمن میں یہ امر ملحوظ رہے کہ اگر صرف شاعر کے کلام سے کوئی مخصوص نفسی کیفیت (مثلاً نرگسیت ہی) جھلکتی ہو تو اسے شخصیت کا مستقل رجحان قرار دینے میں جلدبازی سے کام نہ لیتے ہوئے سوانحی مواد یا دیگر قابلِ حصول خارجی شواہد سے بھی استفادہ کرنا چاہیئے. گو ہمارے قدیم شعراء کے بارے میں نفسی اہمیت کا مواد . . . . جیسے خطوط، ڈائری یا خود نوشت سوانح حیات . . . . . بالعموم دستیاب نہیں. اس لیے جو تھوڑا بہت مواد ہے اسے ہی زیادہ سے زیادہ کام میں لانا چاہیئے.

نفسیاتی یا تحقیقی، مقاصد کے لیے کسی دیوان کا مطالعہ کرتے وقت غزلوں کی تاریخ تحریر سے لاعلمی نفسی مطالعہ میں سب سے زیادہ رکاوٹ بنتی ہے، بلحاظ ردیف حروفِ تہجی کی ترتیب زمانی نہیں اور جب تمام غزلیں ردیف کی لڑی میں پرو دی جائیں تو ان سے کسی شاعرانہ جذبہ کے آغاز اور تدریجی ارتقاء یا انحطاط کا اندازہ لگانا ناممکن ہو جاتا ہے. یہ وضاحت اس لیے ضروری تھی کہ اس مضمون ایسے کسی بھی نفسی مطالعہ میں حالاتِ زیست اور خصوصیت سے مخصوص اثرات کے حامل نفسی حوادث کی روشنی میں جب تک کلام کا تجزیہ نہ کیا جائے . اس وقت تک اخذ شدہ نتائج کے ادبی لحاظ سے دلچسپ ہونے کے باوجود ان کی نفسی صداقت کی قسم نہیں کھائی جا سکتی. یوں بھی فن کار کی پیچیدہ تر شخصیت کا نفسیاتی مطالعہ آسان نہیں ہوتا. لیکن جب

شاعر اور نقاد میں ایک صدی حائل ہو تو یہ کام اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

غالب کا معاملہ بعض اور شعراء کی مانند اتنا مشکل نہیں۔ اس کی زندگی اور فن کے بارے میں قابل اعتماد تصانیف کے علاوہ خود اس کے خطوط بھی موجود ہیں۔ یہ خطوط نفسیاتی لحاظ سے ایک ایسے آئینے کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جس میں اس کی شخصیت کی کئی جھلکیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔

غالب کے خطوط کے مطالعہ سے ایک چیز نمایاں طور سے قاری کے ذہن میں آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ غالب اپنی انفرادیت کے اظہار کی ہر ممکن طریقہ سے سعی کرتا ہے۔ اپنی وضع قطع، خیالات، نظریات وغیرہ میں غالب سب سے نمایاں نظر آنے کا خواہاں معلوم ہوتا ہے۔ آج ہمارے پاس غالب کے بارے میں ایسا نفسی مواد موجود نہیں جس سے ہم اس کی شخصیت کے عناصر ترکیبی اور اس کے لاشعوری محرکات سے واقف ہونے کے لیے اس کی تحلیل نفسی کر سکیں۔ اس لیے انفرادیت کے اس شدید رجحان کے بارے میں قیاس سے ہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ اسی احساس برتری کی پیداوار ہوگا جس کی اساس احساس کمتری بنا کرتا ہے۔ اس ضمن میں یہ امر بھی ذہن نشین رہے کہ غالب میں انانی برتری کا احساس[1] خاصی شدت سے ملتا ہے۔ وہ[2] اپنی فارسی گوئی پر اردو کی نسبتاً بدرجہا فخر کرتے تھے۔ ایرانی شاعروں کے علاوہ ہندوستان کے کسی فارسی گو شاعر کو یہ استثنائے خسرو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ابتدا میں بیدل کا تتبع، غامض مضامین اور اسلوب۔

---

[1]۔ منشی شیو نرائن کو ایک خط میں لکھا ہے۔ "نواب اسد اللہ خان لکھو یا مرزا اسد اللہ خاں بہادر کا لفظ دونوں حال میں واجب اور لازم ہے"۔

[2]۔ فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ من است

"..... یہ سب کچھ خود کو دیگر شعراء سے ممتاز رکھنے ہی کا تو ایک انداز تھا۔[1] اسی طرح جب اردو خطوط کا آغاز کیا تو اپنے لبادے اور ٹوپی کی مانند اس میں بھی جدت پسندی سے اپنی انفرادیت منوانے کے لیے نئی راہ نکالی۔ اس کا دعویٰ انہوں نے "پنج آہنگ" میں بھی کیا ہے"[2]

غالب کے خطوط سے اس کی جو نرگسی تصویر ابھرتی ہے۔ اس میں اشعار مزید رنگ آمیزی کرتے ہیں۔ اس نے کہا تھا:

شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

نفسیاتی لحاظ سے یہ واقعی درست ہے اس کے بعض اشعار، ایسے اشعار جو غزل کے روایتی اور سکہ بند مضامین سے ہٹ کر ہیں..... واقعی اس کے دل (اور ذہن) کا معاملہ کھول کر رکھ دیتے ہیں۔

اس موقع پر اس امر کی وضاحت لازم ہے کہ غالب کے تمام کلام ہی کو نرگسی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اس کا مزاج فلسفیانہ تھا اور اس نے زندگی اور اس کے مسائل پر فلسفیانہ انداز سے ہی نہ سوچا بلکہ نظم کا تو باقاعدہ فلسفیانہ تصور بھی ملتا ہے۔ اسی طرح کچھ تصوف بھی ہے۔ گو وہ برائے شعر گفتن ہی سہی، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے رنگا رنگ کلام پر صرف نرگسیت کا لیبل چسپاں کر کے اپنی دانست میں اس کی تحلیل نفسی کر دینا

---

[1]۔ مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
ہوتے ہیں ملول اس کو سن کر جاہل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل!

[2]۔ غالب ..... خطوط کے آئینہ میں"

غالب کی تمام شاعری کو غلط رنگ میں پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ادب کے قارئین کو گمراہ کرنے کے مترادف بھی ہوگا۔ لیکن اس احتیاط پسندی کے باوجود اس امر پر یقیناً زور دوں گا کہ غالب کے کلام میں نرگسیت ایک قوی رجحان کی صورت ہی میں نہیں ملتی۔ بلکہ یہ رجحان ایک مخصوص انداز سے اظہار بھی پاتا ہے۔

غالب کی غزلوں میں نرگسیت اپنے سیدھے سادھے مفہوم یعنی الفت ذات ہی میں نہیں ملتی، بلکہ منشور PRISM سے گزرتی شعاع کی مانند وہ کئی رنگوں میں جھلکتی ہے۔ وہ اپنے عیوب پر نازاں ہو یا اپنے جذبات کے بارے میں مبالغہ برتے، وہ پرانے عاشقوں پر طنز کرے یا حسن پر اپنی برتری ثابت کرے، وہ محبت کا جواب محبت سے چاہے یا رشک کا مریضانہ اظہار ہو اور یا پھر خالص تعلی۔ اس نے ان سب پر اپنے مخصوص انداز میں اشعار کہے، لیکن ان سب نے جلا نرگسیت ہی سے پائی۔

مندرجہ ذیل مثالوں سے اس کی وضاحت ہو جائے گی۔

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

عرض کیجیے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسد
صحرا ہماری آنکھ میں اک مشتِ خاک ہے

نام کا میرے ہے جو دکھ کہ کسی کو نہ ملا
کام میں میرے ہے جو فتنہ کہ برپا نہ ہوا

ان تمام اشعار میں روایتی مضامین کو روایتی انداز (اور بعض اوقات مبالغہ) سے بیان کیا گیا ہے۔ لیکن ذرا غور سے یہ واضح ہو جائے گا کہ یہ روایتی مضامین اور بیان کا مبالغہ دونوں ہی غالب کی "میں" کو اجاگر کرتے ہیں۔ اور ان تمام اشعار میں متنوع انداز سے اس نے اپنی ذات کو PROJECT کرنے کی کوشش کی۔ اس موقع پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ ایسے روایتی اشعار تقریباً ہر غزل گو کے ہاں مل سکتے ہیں، پھر غالب کے ان اشعار نے کیوں نفسی اہمیت حاصل کی؟ دیگر شعراء کے ہاں یقیناً ایسے اشعار ملتے ہیں اور نہ اسے جھٹلانے کی ہی ضرورت ہے۔ اور اگر ان کے کلام میں نرگسیت کے غماز اور اشعار بھی ملیں تو اس نوع کے بظاہر عام اور گھسے پٹے مضامین والے اشعار بھی نفسی اہمیت اختیار کر جاتے ہیں۔ (اس ضمن میں میر کی مثال بھی دی جا سکتی ہے،

غالب کے یہ اشعار بھی روایتی ہونے کے باوجود اسی لیے نفسی اہمیت اختیار کر جاتے ہیں. کہ اشعار سے غالب کی شخصیت کی بننے والی تصویر کو مصوری کی شبیہہ سے نہیں بلکہ کسی "MOSAIC" سے مشابہ قرار دیا جا سکتا ہے. ایسے اشعار جب انوکھا زاویہ یا نیا رنگ مہیا کرتے ہیں. تو پھر روایتی اور پامال ہونے کے باوجود انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا.

ان روایتی اشعار کے ساتھ ساتھ عشق و عاشقی کے ضمن میں اس نے بعض اوقات روایت شکنی کا ثبوت دیتے ہوئے کہیں بلا واسطہ اور کہیں بالواسطہ طور سے اپنی انا گیت کو اجاگر کیا ہے. اس مقصد کے لیے ان اشعار کا مطالعہ بے حد دلچسپ ہے. جہاں دنیائے عشق کے مسلمہ قوانین اور بعض نامور ہستیوں کے ساتھ اپنا موازنہ کرتے ہوئے ان پر طنز سے اپنی اور اپنے عشق کی برتری ثابت کرنے کی سعی ملتی ہے. یہ مثالیں نمایاں ہیں:

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

عشق و مزدوریٔ عشرت گہِ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامیٔ فرہاد نہیں

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طُور کی

فنا تعلیم درسِ بے خودی ہوں اس زمانے سے
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوار دبستاں پر

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصور نہیں

پہلے اشعار کے برعکس ان اشعار میں نہ تو روایتی مضامین ہیں اور نہ غلط قسم کا مبالغہ ہی۔ بلکہ جدّت پسندی سے کام لیتے ہوئے بعض روایات اور مسلمات کی تکذیب تو کی لیکن اس انداز سے کہ ساتھ ہی اپنی ذات بھی ابھر آتی ہے۔ پہلے شعر میں گو اپنی ذات کا واضح طور سے تذکرہ نہیں کیا گیا۔ لیکن فرہاد کو یوں سر گشتۂ خمارِ رسوم و قیود کہا گیا کہ قاری کے ذہن میں خود بخود ہی تقابل سے غالب کا عشق آجاتا ہے۔ جس میں تیشے کے بغیر ہی مرا جاتا ہے:

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالب
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

غزل کی سب سے قدیم اور اہم روایت عشق ہے۔ اور غالب اس روایات کی علامت پر ہی طنز نہیں کرتا بلکہ وہ تو حسن پر بھی چوٹ کرنے سے گریز نہیں کرتا:

پوچھ مت رسوائیِ اندازِ استغنائے حسن
دستِ مرہونِ حنا، رخسار رہنِ غازہ تھا

اس انداز کے حامل اشعار زیادہ نہیں۔ لیکن جو تھوڑے بہت ہیں، انکی اہمیت اس بناء پر مسلّم کہ اپنی ذات میں مست اور اپنے وجود کے حسن میں غرق کوئی نرگسی ہی طعنہ زن ہو سکتا ہے؛

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

اس تمام غزل میں محبوب سے خطاب کا جو انداز رکھا گیا ہے اس کا اندازہ اس ایک شعر سے ہی لگایا جا سکتا ہے؛

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

محبوب سے خطاب کا یہ طریقہ ایک نئی بات تھی۔ یہ ایک ایسے عاشق کے جذبات ہیں جو خود کو کم تر نہیں سمجھتا۔ اسی لیے تو غالب یکطرفہ محبت کا قائل نہیں۔ اب تک تو غزل کا عاشق عشق کی آگ میں جلتا اور اس پر ناز کرتا ہے۔ لیکن غالب نے عشاق کی اس بھیڑ سے خود کو یوں ممیز کیا؛

نوازش ہائے بے جا دیکھتا ہوں
تغافل ہائے رنگیں کا گلہ کیا ؟

ٹ۔ غالب کا ایک غیر مدوّن شعر یوں ہے ؛

مزا تو جب ہے کہ اے آہِ نارسا ہم سے
وہ خود کہے کہ بتا، تیری آرزو کیا ہے ؟

نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں
تغافل ہائے تمکیں آزما کیا؟
سن اے غارت گرِ جنسِ وفا سن
شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا؟

وہ بھی دن ہو کہ اس ستم گر سے
ناز کھینچوں بجائے حسرتِ ناز

اور اس رجحان کی انتہا پسندانہ مثالیں یوں ہیں :

واں وہ غرورِ عز و نازیاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

محبوب کے بارے میں ایسا رویہ رکھنے کی سب سے بڑی وجہ الفتِ ذات ہے اور ایسی مسلسل غزلوں، متفرق اشعار اور مقطعوں کی کمی نہیں جنہیں نرگسیت کی واضح مثال قرار دیتے ہوئے اس کی ذات کے لیے کلیدی اہمیت کا حامل قرار نہ دیا جا سکتا ہو۔ اس موقع پر مقطع کا خصوصی تذکرہ کیا گیا کہ نفسیاتی لحاظ سے غزل میں مقطع اس بنا پر خصوصی اہمیت اختیار کر جاتا ہے کہ تخلص کی وجہ سے بعض اوقات شاعر اسے بالکل ذاتی بناتے ہوئے اس سے نرگسی رجحان کی تسکین کا سامان بہم پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ تعلی کی ذیل میں آنے والے تمام مضامین دراصل نرگسیت کے غماز ہوتے ہیں . . . حریفوں پر چوٹیں، ناقدریٔ زمانہ، فن کا زعم اور الفتِ ذات کے تحت خالص شخصی انداز اپنانا . . .

غرضیکہ اس میں خاصا تنوع ملتا ہے۔ ایسے اشعار غزل کے درمیان بھی مل سکتے ہیں، لیکن تخلص کی بنا پر مقطع میں یہ نفسی اہمیت حاصل کر لیتے ہیں۔ تخلص کا انتخاب جن نرگسی رجحانات کی آئینہ داری کر سکتا ہے ان کا مطالعہ اور تفصیل کا موقع یہاں نہیں۔ غالب کے بعض مقطعے ہی ان کی نرگسیت پر روشنی ڈالتے ہیں،

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکر ہو رشک فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

اور اس مقطع میں منفی انداز سے نرگسیت کو ابھارا ہے:

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجیے ہائے ہائے کیوں

غالب کی نرگسیت مقطعوں کے علاوہ بھی اظہار پاتی ہے:

درخورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

اس ضمن میں ان کی بعض "مسلسل" غزلیں بھی خصوصی توجہ چاہتی ہیں اور یہ دو غزلیں تو خاص اہمیت رکھتی ہیں، ان کے مطلعے درج ذیل ہیں:

ہر قدم دورئ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

اور

بازیچۂ اطفال ہے دنیا میرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا میرے آگے

لیکن نرگسیت کے مطالعہ میں سرفہرست ان کی یہ مشہور غزل ہے۔ اور میرے خیال میں یہ غالب ہی کی نہیں بلکہ اردو کی بہترین نرگسی غزل ہے۔ اس کا مطلع اور مقطع درج ہیں:

حسن غمزہ کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد
آئے ہے بے کسیٔ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

ان تینوں غزلوں کی ردیفیں بھی نفسیاتی دلچسپی کی حامل ہیں۔ ردیف کو ذات کا حوالہ بنا کر غزلوں کا مسلسل ہونا اس امر کا غماز ہے کہ تخلیق کے اس ارتقائی انداز سے جو لاشعوری تسکین پا رہا تھا۔ وہ اسے ایک آدھ شعر تک محدود نہیں رہنے دیتی اور ایک ہی جذبے کی حامل مسلسل غزل لکھواتی ہے۔ یہی وہ مواقع ہوتے ہیں جب لاشعور تخلیقی لاشعور کا روپ دھار لیتا ہے۔

غالب کا شدید بلکہ مریضانہ رشک مدتوں سے نقادوں کی توجہ کا مرکز رہا ہے میرے خیال میں اسکا بھی نرگسیت کی روشنی میں جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ نرگسی کیلئے اول تو ذات کے دائرے سے نکلنا اور مریضانہ حالتوں میں اچھی خاصی دلدل ثابت ہونے والی الفت ذات سے چھٹکارا پانا ہی آسان نہیں، لیکن جب وہ کسی اور ہستی میں اپنی ذات کی جھلک دیکھ لے تو پھر وہ کیونکہ اس سے اپنی ذات کی تطبیق کر لیتا ہے۔ اس لیے اس کی محبت بھی روایت کے نرگس ایسی ہوگی۔ یعنی محبوب کو آئینہ تصور کرتے ہوئے اس میں اپنا ہی عکس دیکھا جائے گا۔ یوں محبوب محض گوشت پوست کے وجود سے بڑھ کر الفتِ ذات اور اس

سے وابستہ نفسی تسکین اور لاشعوری آسودگی کے لیے ایک اعلیٰ اور ارفع ترعلامت کا روپ دھار لیتا ہے۔ غالب کا یہ شعر تحلیلِ نفسی کے نرگسی مفہوم کی خوب صورت ترین تشریح ہی نہیں کرتا بلکہ محبوب سے نرگسی محبت کی اساس بھی مہیا کرتا ہے،

پچ کہتے ہو خود بین و خود آرا ہوں نہ کیوں ہوں
بیٹھا ہے بتِ آئینہ سیما مرے آگے

یوں "بتِ آئینہ سیما" سے محبت دراصل اپنے آپ ہی سے محبت ہوتی ہے۔ اس پر مستزاد اپنے حسنِ انتخاب کا احساس جو اور بھی آسودگی بخش ثابت ہوتا ہے۔ غالب کی نرگسیت بھی جب اپنے لیے محبوب کے وجود میں پیوستگی کے لیے ایک مرکز تلاش کر لیتی ہے۔ تو وہ کیونکہ بنیادی طور سے صحت مندانہ نہیں، اس لیے تصرفیت کو جنم دے کر رشک و حسد کے لیے مہیج بہم پہنچاتی رہتی ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار غالب ایسا نرگسی ہی لکھ سکتا ہے:

کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

اُبھرا ہوا نقاب میں ہے اُن کے ایک تار
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ
ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں ؟

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
مرتے ہیں ولے ان کی تمنا نہیں کرتے

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالبؔ
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

۱۹۸۹ء

نیاز احمد نے

آر۔آر پرنٹرز لاہور سے چھپوا کر

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

سے شائع کی۔

تعداد : ایک ہزار

قیمت : ۳۰/۰۰ روپے

تخلیق تخلیقی شخصیات اور تنقید

ڈاکٹر سلیم اختر